OPEN ACCESS

AL-TABYEEN

(Bi-Annual Research Journal of Islamic Studies)

Published by: ***Department of Islamic Studies, The University of Lahore, Lahore.***

ISSN (Print) : 2664-1178
ISSN (Online) : 2664-1186
Jul-Dec-2021
Vol: 5, Issue: 2
Email: altabyeen@ais.uol.edu.pk
OJS: hpej.net/journals/al-tabyeen/index

جدید تفسیری ادب میں بنت الشاطیؒ کی امتیازی خدمات: ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر جمیل اختر*

ڈاکٹر مبشر حسین**

ABSTRACT

'Āisha bint Abdu Al-Rahmān (1913-1998), better known by her pen nickname ‘Bint Ash-Shātī’, was one of the 20th century Egyptian exegetes (*mufassirīn*) of the *Qur'ān* who implemented the methodological approach to the interpretation of the *Qur'ān* introduced by her teacher, mentor and husband *Amīn al-Khawlī*, an eminent Egyptian scholar of the *Qur'ān* who contributed to the *Qur'ānic* sciences from several important aspects. Bint Ash-Shātī continued the legacy of her teacher and published a number of works related to the discipline of the *Qur'ānic* sciences such as *al-Tafsīr al-Bayānī li al-Qur'ān al-Karīm* and *al-I'jāz al- Bayānī li al- Qur'ān wa Masā'īl Ibn al-Azraq*. She made an attempt to examine all the previous *Qur'ānic* exegeses. Though Bint Ash-Shātī benefited from the classical *tafsīr* literature in her writings, she made several critiques on the classical *tafsīr* literature. Because of her scholarly approach, she became a famous *Qur'ānic* scholar in her life and even she was awarded with the King Faisal Award,

* لیکچرر، شعبہ علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف گجرات، گجرات

** ایسوسی ایٹ پروفیسر، شیخ زاید اسلامک سنٹر، جامعہ پنجاب لاہور، فل برائٹ اسکالر، ہارورڈ یونیورسٹی، امریکہ

the most prestigious awards in the Muslim world, in 1993 for her intellectual contributions. This paper attempts to analyze the methodological approach adopted by Bint Ash-Shātī in her works on *Qur'ānic* studies.

Key words: تفسیر، قرآن کریم، بنت الشاطی، منہج، اعجاز، مصادر، اسباب نزول

قرآن مجید کی تفسیر دراصل اللہ تعالیٰ کی مراد تک پہنچنے کی انسانی کوشش کا نام ہے، بقول محمد عبد العظیم الزرقانیؒ (م:۱۹۴۸ء): "تفسیر ایسے علم کا کہتے ہیں جو الفاظِ قرآن کی دلالت کو سامنے رکھتے ہوئے انسانی استطاعت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی مراد تک پہنچانے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔"(1) مفسرین قرآن نے ہر دور میں اپنی انسانی بساط کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر کی ہے جس کے نتیجے میں ایک وقیع تفسیری ادب ظہور پذیر ہوا۔ اس ضمن میں مفسرین نے آپس میں بہت سے مقامات پر الفاظ کا معنی و مفہوم متعین کرنے میں اختلاف بھی کیا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں اہل مغرب نے مختلف علوم وفنون کے تجزیہ و تنقیح کے جدید اصول وضع کیے تو الہامی کتابوں پر ان اصولوں کے اطلاق کے ضمن میں ایک منفرد تنقیدی دور شروع ہوا اور اس تنقید کا آغاز اہل مغرب نے بائبل سے کیا، اور اس پر مختلف طریقوں سے تنقید کی۔(2) ان کے تنقیدی منہج کی بنیاد خالصتاً انسانی عقل پر رکھی گئی۔(3) یہ تنقیدی سلسلہ قرآن مجید تک بھی پہنچا اور بہت سے مغربی اہل علم نے قرآن مجید کے متن، تفسیر اور تفسیری اصولوں کو خوب تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا، جس کے ردعمل میں ایک طرف تو اہل مغرب کے خلاف اسی طرح مناظرانہ ادب مسلمانوں کی طرف سے سامنے آیا جس طرح شروع ہی سے غیر مسلموں کی قرآن، پیغمبر علیہ السلام اور اسلام کو غلط ثابت کرنے کی کوششوں کے جواب میں آتا رہا ہے۔(4) دوسری طرف عالم اسلام میں

1۔ الزرقانی، محمد عبد العظیم ، مناهل العرفان في علوم القرآن، دار الكتب العربي، بيروت، ١٩٩٥ء، ٢: ٤

2. Browning, W.R.F., Biblical Criticism, A Dictionary of the Bible, 1997. (Retrieved October 4, 2015 from http://www.encyclopedia.com)

3. Robinson, B.A. Biblical Criticism...Ontario Consultants on Religious Tolerance 2008. (Retrieved March 18, 2015 from http://www.religioustolerance.org/chr_hcri.htm)

4. John of Damascus, De Haeresibus. Migne. Patrologia Graeca, vol. 94, 1864, cols 763-73. (Translated by Reverend John W Voorhis appeared in THE MOSLEM WORLD for October 1954, pp. 392-398)

ایسی علمی شخصیات سامنے آتی رہیں جنھوں نے اپنے اسلامی علوم و فنون پر از خود نظر ثانی یا تنقیدی مطالعہ کی اہمیت پر زور دیا۔ عالم اسلام میں ان نئے تفسیری رجحانات کو قبول یا رد و قدح کا موضوع بنانے کے حوالے سے مصر کی سر زمین سب سے زیادہ زرخیز ثابت ہوئی جہاں ایک سے بڑھ کر ایک صاحب علم پیدا ہوا اور تفسیری ادب میں اپنے طور پر اضافہ کرتا گیا۔ زیر نظر مقالہ میں بنت الشاطئ کی تفسیری خدمات کو اسی تناظر میں زیر بحث لایا گیا ہے۔

"بنتِ الشاطئ" کا تعارف

عائشہ بنت عبد الرحمن جو اپنے قلمی نام "بنتِ الشاطئ" سے زیادہ معروف تھی، مصر کے ایک قصبے دمیاط میں ۶ نومبر ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئیں،[1] اس قصبے کی آبادی تیس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔[2] جبریل بیئر (م:۱۹۸۲ء) کے مطابق، عائشہ بنت الشاطئ کا شمار چند ایک ان معروف مصری اہل علم میں سے تھا جو کہ دیہی علاقہ جات میں پیدا ہوئے اور جن کے پاس پڑھنے لکھنے کے کوئی زیادہ وسائل بھی نہ تھے لیکن اپنی اہلیت اور محنت کی بناپر انہوں نے اعلیٰ مقام اور تاریخ میں اپنا نام کمایا۔[3]

بنتِ الشاطئ بطورِ مصنفہ

بنت الشاطئ نے اٹھارہ سال ہی کی عمر میں خواتین کے ایک مجلہ "**النھضۃ الاسلامیۃ**" میں لکھنا شروع کر دیا تھا جس کی صدارت محترمہ لبیبہ احمد کیا کرتی تھیں۔ دو سال بعد آپ نے وہاں کے مقبول ترین علمی مجلہ "**الاھرام**" میں بھی لکھنا شروع کر دیا۔ جب جریدہ اہرام میں آپ کے کچھ علمی مضامین شائع ہوئے جنہیں قارئین کی طرف سے کافی سراہا گیا تو اس کے بعد جریدہ اہرام کے چیف ایڈیٹر نے بنت الشاطئ کو بطور ایڈیٹر ملازمت کی پیش کش کی۔ آپ نے اپنی پہلی کتاب اس وقت تالیف کی جب آپ یونیورسٹی کے دوسرے سال کی طالبہ تھیں۔ آپ نے بہت سا تحریری لٹریچر اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔

---

[1] ۔ ڈاکٹر حسن جبر، بنت الشاطئ من قریب، دار الکتاب الحدیث، قاہرہ، ۲۰۰۱ء، ص:۱۵

[2] Baer, Gabriel, The Beginnings of Urbanization, Studies in the Social History of Modern Egypt, The University of Chicago Press, Chicago, 1969, pp. 133-148

[3] Baer, Gabriel, 'Fellah and Townsman in Ottoman Egypt?' A Study of Shirbini's Hazz al-Quhuf Asian and African Studies 8, 1972, pp. 221-256

علمی مناصب

بنتِ الشاطئ عرصہٗ دراز تک درس و تدریس کے ساتھ مربوط رہیں، اور اس دورانیہ میں آپ کئی اعلیٰ علمی مناصب پر بھی فائز رہیں، مثلاً:

- آپ ۱۹۷۰ء سے اپنے آخری ایام تک مغرب کی قرویین یونیورسٹی میں شریعہ فیکلٹی میں پروفیسر رہیں۔
- آپ فروری ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۲ء تک مصر کی عین الشمس یونیورسٹی کے شعبہ عربی کی چیئرپرسن رہیں۔
- آپ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۴ء تک قاہرہ کی عرب یونیورسٹیوں کے معہد کی نمائندہ پروفیسر رہیں۔

اس کے علاوہ آپ کئی ایک یونیورسٹیوں میں بطور وزٹینگ پروفیسر کے بھی پڑھاتی رہیں۔[1]

آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ بہت سی اسلامی تنظیمات نے آپ کے علاوہ کسی خاتون کو اپنا ممبر نہیں بنایا تھا، ان تنظیمات میں سے "مجمع البحوث الاسلامية – القاهره" اور کئی ایک قومی ادارے تھے۔[2] اسی طرح ۱۹۳۶ء میں قاہرہ میں منعقد ہونے والی پہلی ایگریکلچر کانفرنس میں آپ کو بطورِ ممبر منتخب کیا گیا۔ بہت سے اداروں اور محاضراتی جگہوں کا نام آپ کی طرف منسوب کیا گیا۔[3]

وفات

جب آپ بروز منگل یکم دسمبر ۱۹۹۸ء کو دل کا دورہ پڑنے کی بدولت اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں، تب ان کی عمر چھیاسی (۸۶) سال تھی۔ جامعہ ازہر کے شیخ نے خود ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔

بنتِ الشاطئ کی تفسیری خدمات

بنت الشاطئ نے اپنی زندگی میں قرآن مجید کے مطالعہ کو بہت اہمیت دی ہے کیوں کہ آپ ایک ایسے دینی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں جو کہ ہر وقت قرآن مجید سے منسلک رہتا تھا۔ آپ بتاتی ہیں کہ جب آپ نو سال کی تھی تب ایک دن خواب میں خود کو اپنے گھر کے ایک کونے میں میز کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اچانک اس کمرے

---

1 ۔Baer, Gabriel, 'Fellah and Townsman in Ottoman Egypt?' A Study of Shirbini's Hazz al-Quhuf Asian and African Studies 8, 1972, pp. 221-256

2 ۔ ایضاً، ص:253

3 ۔ ایضاً، ص:254

کی کھڑکی سے ایک فرشتہ نمودار ہوا، آپ کو غلاف میں لپٹی ہوئی کوئی چیز دی اور آسمان کی طرف واپس لوٹ گیا جب آپ نے اس غلاف کو کھولا تو اس میں قرآن مجید تھا اور آپ نے اس جیسا قرآن پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔[1] اس خواب کے بعد، آپ قرآن کے مطالعہ میں زیادہ مشغول ہو گئیں۔

بنت الشاطئ کا سب سے ادبی و علمی کام قرآن مجید کا ایک خاص اسلوبِ تفسیر ہے جس میں آپ قرآن مجید کی نصوص کو قرآن ہی کے سیاق وسباق سے سمجھنے کا منہج پیش کیا ہے۔[2] اس حوالے سے بنت الشاطئ نے "**التفسیر البیانی للقرآن الکریم**" کے نام سے قرآن مجید کی چودہ سورتوں کی تفسیر بھی لکھی جو دو جلدوں پر محیط ہے جس کی پہلی جلد ۱۹۶۲ء میں طبع ہوئی۔ بنت الشاطئ نے اس کتاب کا انتساب اپنے استاد محترم اور عزیز شوہر امین الخولی کے نام کیا۔ بنت الشاطئ فرماتی ہیں کہ میں اپنے والد محترم سے متاثر ہو کر مطالعہ قرآنیات کی طرف راغب ہوئی اور اسے میں نے اپنے خاوند امین الخولی کی مدد سے مکمل کیا۔ میرے استاد امین الخولی نے مجھے تفسیری ادب میں ایک خاص اصولی منہج سے متعارف کرایا ہے۔ آپ نے کسی خاص نقطہ نظر کی بنیاد پر اس کتاب میں قرآن مجید کی مختصر سورتوں کا انتخاب کیا جس میں آپ نے الفاظِ قرآن کی لغوی اعتبار سے وضاحت کی اور قرآن مجید میں ایک مادہ سے بننے والے مختلف صیغہ جات کی قرآنی آیات کے سیاق وسباق کے لحاظ سے حسی اور مجازی استعمال کے حوالے سے بحث کی ہے۔ بنت الشاطئ کا طریقہ کار اس تفسیر میں یہ رہا ہے کہ الفاظِ قرآنی کی لغوی لحاظ سے آپ نے وضاحت کی ہے اور بطورِ استشہاد بہت سی احادیث بھی ذکر کی ہیں۔ آپ اپنی تفسیر میں مذکور قرآنی سورتوں کے ربط کو بھی زیرِ بحث لائی ہیں۔ متقدمین میں سے مختلف مفسرین کی تفسیری آراء بھی ذکر کی ہیں۔ کہیں ان سے مستفید ہوئی ہیں اور کہیں ان پر نقد کرتے ہوئے اپنی علمی استعداد کی بنا پر اضافے بھی کیے ہیں۔ تفصیلات سے پہلے ان کے تفسیری مصادر کو جاننا مفید ہو گا۔

بنتِ الشاطئ کے تفسیری مصادر

بنتِ الشاطئ نے جن مصادر پر اپنے تفسیری کام میں اعتماد کیا ہے ان کو ذیل کے گروپس میں تقسیم کیا جا سکتا

---

[1] ۔ عائشه بنت الشاطئ، القرآن وقضايا العصر، دار العلم للملايين، بيروت، 1978ء، ص:39

[2] Jansen, Johannes J. G., The Interpretation of the Koran in Modern Egypt, E. J. Brill, Leiden, 1974, pp. 69-76

ہے:

(۱) تفسیری مصادر: جامع البیان (از ابن جریر الطبري)، مفاتیح الغیب (از فخر الدین الرازي)، تفسیر غرائب القرآن (از نظام الدین النیسابوري)، الکشاف (از زمخشري)، تفسیر جزء عم (از إمام محمد عبدہ)، نظم الدرر في تناسب الآیات والسور (از برهان الدین)، مجمع البیان (از طبرسي)، تفسیر الجلالین (از جلال الدین المحلی، اور جلال الدین السیوطي)، التبیان في أقسام القرآن (از ابن القیم الجوزیة).

(۲) علوم القرآن کے مصادر: الإتقان في علوم القرآن (از سیوطي)، الإعجاز القرآني (از جرجاني)، التیسیر (از أبو عمرو الداني).

(۳) احادیث کے مصادر: صحیح البخاري، صحیح مسلم، موطأ إمام مالک، سنن ابن ماجہ

(۴) سیرتِ نبویہ کے مصادر: السیرۃ النبویۃ (از ابن إسحاق)، السیرۃ النبویۃ (از إبن هشام)، عیون الأثر (از ابن سید الناس)

(۵) لغت و نحو کی ڈکشنریاں: المفردات (از راغب الأصفهاني)، معاني القرآن (از فراء)، الجمل الکبری (از زجاج)، مغني اللبیب (از ابن هشام)، الفروق (از أبو هلال)، لسان العرب (از ابن منظور)، الصحاح (از جوهري)، القاموس المحیط (از فیروزآبادي)، أساس البلاغة (از زمخشري)

(۶) دیگر مصادر: أستاذ أمین الخولي (ان کی آراء وافکار)

واضح رہے کہ موخر الذکر مصدر یعنی استاد الخولی بنت الشاطئ کا سب سے اہم مصدر ہے، اس لیے کہ موصوفہ نے اپنے قرآنی و تفسیری مباحث بنیادی طور پر اپنے استاد امین الخولی کے ان تفسیری اصول وضوابط کی روشنی میں لکھے ہیں جن کی وضاحت الخولی نے اپنی کتاب "مناهج التجدید في النحو والبلاغة والتفسیر والأدب" میں کی تھی۔[1]

بنت الشاطئ کا تفسیری منہج

بنتِ الشاطئ آیات قرآنیہ کی تفسیر میں استاد الخولی کے اختیار کردہ اصول تفسیر کی پیروی کرتے ہوئے قرآنی

[1] ۔ یہ کتاب ۱۹۶۱ء میں مصر کے "دار المعرفہ" سے شائع ہوئی تھی۔

آیات کا موضوعات کے لحاظ سے مطالعہ کرتی ہیں نہ کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب کے لحاظ سے۔ اسی طرح قرآن مجید کے متعلقات کا مطالعہ ---جیسا کہ وقتِ نزول، سببِ نزول، اور تعدد قراءات وغیرہ--- بھی آپ کے تفسیری منہج میں نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ آپ کے منہجِ تفسیر کی ایک اہم چیز یہ ہے کہ آپ قرآنی آیات کو وہ معانی پہنانے کی کوشش کرتی ہیں جو کہ لغتِ عرب سے ثابت ہوتے ہیں اور جو معانی نزولِ قرآن کے وقت اہلِ عرب کے ہاں بھی معروف تھے، جیسا کہ موصوفہ لکھتی ہیں: "ہم دلالتِ الفاظ کے فہم میں اصل لغوی دلالت تلاش کرتے ہیں جو عربی لغت میں کسی مادہ / لفظ کے مختلف حسی اور مجازی استعمال کی طرف ہماری رہنمائی کرے۔ پھر ہم اس لفظ کے ان مختلف صیغوں سے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں، دلالت قرآنی کی تعیین کرتے ہیں، اور ہم ایک آیت یا سورت میں کسی خاص سیاق کے متعلق یا پورے قرآن میں اس کے عمومی سیاق کے متعلق بھی غور و فکر کرتے ہیں۔"[(1)] آئندہ صفحات میں بنت الشاطی کے منہجِ تفسیر سے متعلقہ کچھ اہم پہلوؤں کی تفصیلات سے تعرض کیا جارہا ہے۔

(ا) آیات کے درمیان مناسبت اور تفسیر موضوعی

اگرچہ علم المناسبت کی ابتدا چوتھی صدی ہجری کی ابتداء ہی سے ہو گئی تھی لیکن اس میں باقاعدہ تالیف آٹھویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوئی جب ابنِ الزبیر الغرناطیؒ(م:۱۳۰۸ء) نے اس فن پر اپنی کتاب "البرهان في ترتيب سور القرآن" تالیف کی۔

استاد الخولی کہتے ہیں: "صحیح موقف کے مطابق قرآن کی موجودہ ترتیب کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآنی آیات کی تفسیر کرنے کی بجائے موضوع کے لحاظ سے تفسیر کی جائے... اگرچہ مفسر کے لیے ضروری ہے کہ وہ وحدتِ سورت اور آیات میں مناسبت اور سیاق و سباق کا بھی خیال رکھے لیکن ایسا تفسیر موضوعی کی وجہ ہی سے ممکن ہے۔"[(2)] اس موقف کی حمایت کرتے ہوئے بنت الشاطی فرماتی ہیں: "(ہمارے) اس تفسیری منہج کی اصل کے مطابق آیات قرآنیہ کی موضوعی تفسیر کی جائے جس میں ایک ہی موضوع سے متعلقہ تمام آیات کو ایک جگہ جمع کیا جاتا

---

[1] ۔ التفسير البيانى للقرآن الكريم، 1: 17

[2] ۔ الخولی، ڈاکٹر امین ، مناهج التجديد في النحو والبلاغة والتفسير والأدب، الهيئة المصرية العامة للكتاب، مصر، 1995ء، ص:229

ہے... تفسیر کا یہ منہج اس معروف منہج اور تفسیری طریقے سے ہٹ کر ہے جس میں قرآن آیات کی سورت کے اعتبار سے تفسیر کی جاتی ہے۔ ہر لفظ اور آیت کو مکمل قرآن کے عمومی سیاق سے ہٹ کر لیا جاتا ہے"۔[(1)] اسی سیاق میں بنت الشاطئ نے تفسیر موضوعی کے منہج کے متعلق کہا ہے کہ "اس تفسیر کے منہج کی بنیاد تفسیر موضوعی کے اہتمام پر ہے جس میں الگ الگ موضوع کے لحاظ سے مطالعہ کیا جاتا ہے، چنانچہ اس موضوع سے متعلقہ تمام قرآنی آیات کو اکھٹا کر لیا جاتا ہے اور االفاظ و اسالیب کے مألوف استعمال سے رہنمائی لی جاتی ہے۔"[(2)]

بنتِ الشاطئ نے قرآن مجید کی تفسیر کے لیے چند مختصر سورتوں[(3)] کا انتخاب کیا، تاکہ آپ تفسیرِ قرآن میں ان اصولِ تفاسیر کا صحیح طرح خیال کر سکیں جن کا پیچھے ذکر ہوا ہے۔ چنانچہ سورۃ العصر کی تفسیر میں آپ نے وحدت موضوع اور مناسبتِ قرآن کے اصول کو جس احسن انداز سے بیان کیا ہے وہ ان کے نقطہ نظر کی عمدہ ترجمانی کرتا ہے۔[(4)]

(۲) بنت الشاطئ اور اسبابِ نزول

قرآنی آیات کے سببِ نزول کے حوالے سے بہت سے دیگر اہل علم کی طرح بنتِ الشاطئ کا موقف بھی یہی ہے کسی خاص سبب کو ملحوظ رکھے بنا قرآن کے عمومی الفاظ کا اعتبار کیا جائے گا۔ اسی لیے وہ ان تمام احادیث کو جو کسی آیت کے سببِ نزول کی وضاحت کرنے آئی ہوں، ذکر کر دیتی ہیں اور ان کے مابین کوئی ترجیح قائم نہیں کرتیں۔[(5)] موصوفہ اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھتی ہیں: "اسبابِ نزول کے متعلق جو جو روایت آتی ہے اس میں وہ احوال جاننے کی ضرورت ہے جس میں اس آیت کا نزول ہوا، اس مفروضہ کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ صحابہ کرامؓ نزول آیات کے زمانے میں موجود تھے اس لیے اس ضمن میں انہی سے روایات نقل کی گئی ہیں اور ہر صحابی نے

---

[1]۔ التفسیر البیانی للقرآن الکریم، 18:1
[2]۔ ایضاً، 17:1
[3]۔ مختصر سورتوں میں درج ذیل سورتیں شامل ہیں: "الذاریات"، "التکویر"، "الانفطار"، "الانشقاق"، "الغاشیة"، "القارعة"، "التکاثر"، "العادیات"، "الفجر"، "النازعات"، "النبأ"، "المرسلات"، "القیامة"، "الحاقة"، "الواقعة"
[4]۔ التفسیر البیانی للقرآن الکریم، 96:2
[5]۔ ایضاً، 18:1

اپنے وہم یا فہم کے مطابق کسی آیت کا سببِ نزول بیان کر دیا۔ علماء قرآن کا یہ کہنا ہے کہ اسبابِ نزول بیان کرنے والی روایات میں بہت زیادہ وہم و گمان موجود ہے، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سبب کا مطلب بالکل یہ نہیں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آیت نازل ہی نہ ہوتی۔ بہر حال اعتبار عمومِ لفظ ہی کا ہو گا جو کہ صریح نص سے سمجھ آ رہا ہو نہ کہ کسی مخصوص سبب کا جس میں اس آیت کا نزول ہوا۔ "[1]

(3) بنت الشاطیٔ اور قرآن کا اعجازِ بیانی

لفظ "**بیان**" کا مطلب ایسی فصیح گفتگو کرنا ہے جس سے معانی کی وضاحت ہو جائے اور سننے والا بآسانی حقیقتِ حال سے واقف ہو جائے۔ جہاں تک قرآن کریم کے اسلوبِ بیان کے معجزانہ پہلو کا تعلق ہے تو اس ضمن میں بنتِ الشاطیٔ فرماتی ہیں: "تفسیرِ بیانی اور قرآنیات کے مطالعہ کے دوران مجھ پر قرآن مجید کے بہت سے رموز آشکار ہوئے جس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اہلِ عرب نے نبی مکرمؐ کی بعثت کے زمانہ میں قرآن مجید کے معجزہ ہونے کا موقف کیوں اختیار کیا اور کس وجہ سے وہ اس بات سے عاجز ہو گئے کہ وہ اس قرآن کے مثل کوئی ایک سورت ہی لا سکیں حالاں کہ وہ اہلِ زبان تھے ان کی اور قرآن کی زبان بھی ایک ہی تھی اور ان کی زبان کی بلاغت و فصاحت بھی معروف تھی۔ بے شک انہیں اعجازِ بیانی کے اسرار و رموز کا علم ہو چکا تھا جس کی بدولت وہ ناامید ہو چکے تھے اسی لیے ان لوگوں نے اس قرآنِ معجز کے کسی لفظ یا کسی آیت کا مثل لانے کی کوشش ہی نہ کی"۔[2]

آپ فہمِ قرآن کے لیے استقرائی منہج[3] کے مطابق چلی ہیں۔[4] آپ اپنی کتاب کی دوسری جلد میں فرماتی ہیں:

---

[1] ۔مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: سعفان، كامل على ، المنهج البيانى فى تفسير القرآن الكريم، مكتبه الانجلو المصريه، ص:115-119

[2] ۔ بنت الشاطئ، عائشه، الإعجاز البيانى للقرآن، دار المعارف، قاہرہ، 1984ء، ص:11

[3] ۔ هو المنهج الذي ينتقل فيه الباحث من الجزء إلى الكل، أو من الخاص إلى العام (ایسا منہج جس میں جزئیات سے کلیات کی طرف یا خاص سے عام کی طرف جایا جائے)۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: ڈاکٹر عبد العزیز بن عبد الرحمن الربیعہ، كتاب البحث العلمي حقيقته ومصادره ومادته ومناهجه وكتاباته وطباعاته ومناقشاته، مكتبه الملك فهد الوطنيه، رياض، 2001ء، 4:1

[4] ۔ التفسير البيانى للقرآن الكريم، 7:1

"قرآن کی تفسیر کے لیے میں نے استقرائی منہج اختیار کیا جس میں الفاظِ قرآنی کو تمام جگہوں سے ایک جگہ جمع کر لیا جاتا ہے تا کہ الفاظ کے صحیح معانی تک پہنچا جا سکے، قرآن مجید میں جس جس مقام پر بھی اس سے ملتی جلتی مثال ملی اس کو ذکر کیا جاتا ہے، ہر آیت اور سورت میں موجود خاص سیاق و سباق پر غور و فکر کیا جاتا ہے اور پھر مکمل قرآن میں اس کے عمومی سیاق کو دیکھا جاتا ہے تا کہ قرآن مجید کے بیانی اسرار و رموز آشکار ہو سکیں۔"[1]

بنتِ الشاطئ اپنے تفسیری نکات میں قرآن کے اعجازِ بیانی کو بڑے احسن طریقے سے بیان کرتی ہیں اور تفسیر کے متعلق اختلافِ علماء کو بیانی طریقے سے حل کرنے کی کاوش کرتی ہیں۔ آیات قرآنیہ کی تفسیر کرتے ہوئے مختلف اقوال پر نقد و جرح کرنے کے حوالے سے بنتِ الشاطئ نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ الفاظ کے حسی و مجازی استعمال اور معانی کی دلالت کے بارے بات کرتی ہیں، اور پھر اس ضمن میں مختلف مفسرین کے اقوال ذکر کرتی ہیں اور ان میں سے صرف وہ قبول کرتی ہیں جو کہ اعجازِ بیانی کے اسرار و رموز اور عربی لغت کے لحاظ سے قرآنی نص کے موافق ہوں جب کہ وہ کتبِ تفسیر میں مذکور اسرائیلی روایات، خاص مسلکی تشریحات اور باطل یا دُور از کار تاویلات کو بالکل قبول نہیں کرتیں۔ اس کی چند مزید مثالیں درج ذیل ہیں:

1۔ ﴿وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ﴾[2]

"اور جو بھی رحمان کے ذکر سے غافل ہو جائے، ہم ایک شیطان اس پر مقرر کر دیتے ہیں تو وہ اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔"

مذکورہ آیت کے ضمن میں بنتِ الشاطئ کہتی ہیں کہ بعض معاصر مفسرین اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے کہ وہ لفظ "**يَعْشُو**" کی وضاحت خود اس کے اپنی لغوی معنی سے کرنے کی بجائے ایک دوسرے لفظ یعنی "**يَنْصَرِف**" سے کرتے ہیں۔ حالانکہ لغت میں ان دونوں الفاظ کے مابین کافی فرق موجود ہے، اس لیے واضح لغوی معنی کو چھوڑ کر "**يَعْشُ**" کی تفسیر "**يَنْصَرِف**" سے کرنا سراسر خبط ہے۔[3]

---

[1] ۔ التفسیر البیانی للقرآن الکریم، 7:2

[2] ۔ الضحی 36:43

[3] ۔ بنت الشاطئ، عائشه، القرآن وقضایا الإنسان، دار العلم للملایین، بیروت، 1978ء، ص:320

۲۔ ﴿ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴾[1]

بنتِ الشاطیؒ لکھتی ہیں کہ مذکورہ آیت میں: "اللہ نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا کہ 'تم اپنے نعلین اتارو، بے شک تم پاک وادی یعنی وادیٔ طویٰ میں ہو۔' جب کہ بعض مفسرین کے بقول: 'یہاں لفظ "**النعلین**" سے دل اور جسم مراد ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملاقات ان چیزوں کے ساتھ ممکن نہیں۔ یعنی انسان کو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لیے یا تو موت کا ذائقہ چکھنا پڑے گا یا پھر زہد و تقویٰ اختیار کرنا پڑے گا۔ اور اللہ نے ان دونوں چیزوں کو جوتوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیوں کہ یہ دونوں ایسے قدم ہیں جن کے ساتھ روح اس مادی دنیا میں مشغول رہتی ہے۔' (بنتِ الشاطیؒ کے بقول) حالانکہ یہ معنیٰ نہ تو قرآنی لغت کے اعتبار سے درست ہے اور نہ ہی عربی و علمی لغت کے اعتبار سے کسی طرح بھی ٹھیک ہے۔"[2] بنتِ الشاطیؒ کے قول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مصطفیٰ محمودؒ (م:۲۰۰۹ء) نے اپنی تفسیر میں مذکورہ واقعہ بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا تفسیر صوفیانہ تفسیر ہے۔[3]

بنتِ الشاطیؒ نے اعجازِ بیانی کے بارے اپنی کتاب میں جو اسلوب اختیار کیا ہے اس حوالے سے آپ خود لکھتی ہیں: "قرآن مجید کے اعجازِ بیانی کے فہم کے بارے آج میں جو کاوش کرنا چاہتی ہوں، اس کے ساتھ میں سلفِ صالحین کی ان خدمات کا ردّ نہیں کرنا چاہتی جو قرآنی آیات کی تفسیر، ترکیب اور بلاغت کے ضمن میں انہوں نے سر انجام دیں۔ بلکہ انہی کاوشوں کی بدولت مجھے اس راستے کی راہ نمائی نصیب ہوئی ہے جس پر میں چل پڑی ہوں۔"[4]

(4) بنت الشاطیؒ اور قرآنی تاویلات

بعض قرآنی الفاظ کے ان کی لغوی تفصیلات کی بنیاد پر بنتِ الشاطیؒ نے اس امر کی تلقین کی ہے کہ الفاظ کے ظاہری اور عمومی معانی ہی پر اکتفا کیا جائے، یا آپ نے ان الفاظ کو ایسے معانی پہنائے ہیں جو سلف صالحین اور

---

[1] ۔ سورة طٰه: 12:2

[2] ۔ القرآن وقضايا الإنسان، ص:320-321

[3] ۔ مصطفى محمود، القرآن..محاولة لفهم عصري، دار المعارف، قاہره، 1999ء، ص:131

[4] ۔ الإعجاز البياني، 12:1

متقدمین مفسرین سے یا تو منقول نہیں یا پھر انہوں نے بعض کمزور روایات، یا ذاتی علم و تجربہ و کشف کی بناء پر الفاظ کے کچھ اور معانی بیان کیے ہیں۔ ایسی تاویلات جن کی لغت عرب بالکل تائید نہیں کرتی، بنت الشاطی کے ہاں تفسیر میں قابل التفات نہیں۔ اس ضمن میں چند مثالیں ذیل میں درج کی گئی ہیں۔

1۔ ﴿ وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا... ﴾[1]

"اور انسان کہے گا کہ اس (زمین) کو کیا ہوا ہے۔"

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بنتِ الشاطیؒ لکھتی ہیں کہ کئی ایک مفسرین کے بقول اس آیت کے لفظ "**الإنسان**" سے صرف کافر اشخاص مراد ہیں کیوں کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر یقین نہیں رکھتے۔ ان مفسرین کے بقول یہ خطاب مومن لوگوں کے ساتھ نہیں ہے کیوں کہ قرآن مجید میں ہے کہ مؤمنین اس دن کہیں گے: ﴿ هَذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ﴾[2]، "یہی تو ہے جس کا اللہ نے عہد کیا اور نبیوں نے سچ کہا تھا۔" تفسیر کشاف، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر جلالین میں یہی تشریح ذکر ہوئی ہے۔ علامہ ابو حیانؒ اپنی تفسیر، "**البحر المحيط في التفسير**" میں تو یہ بھی لکھتے ہیں کہ جمہور کا یہی مذہب ہے۔ لیکن بنتِ الشاطیؒ نے اس کے برعکس یہ رائے اختیار کی ہے: "مجھے تو ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ یہاں لفظ "انسان" کو صرف کافر اشخاص کے لیے مخصوص کر لیا جائے۔ نہ تو عربی لغت اس تخصیص کی تعیین کرتی ہے، نہ ہی قرآنی استعمال اس تاویل کی تائید کرتا ہے۔ مزید برآں اس تخصیص سے معنوی لحاظ سے بھی تقویت نہیں ہوتی۔ جہاں تک زلزلے کی تھرتھراہٹ اور میدان حشر میں جمع ہونے کی ہولناکی کا بات ہے تو اس سے کوئی بھی خوف کھا سکتا ہے چاہے وہ کافر ہو یا مؤمن۔ اس ڈر، خوف اور دہشت کو صرف کافر شخص کے ساتھ مختص کر دینا درست نہیں۔"[3]

2۔ ﴿فَأَرَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَى﴾[4]، غرض انہوں (حضرت موسیٰؑ) نے اس (فرعون) کو بڑی نشانی دکھائی۔

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر و تشریح میں بعض علماء کا یہ کہنا ہے کہ لفظ "**الآیة** (نشانی)" سے مراد حضرت موسیٰؑ کا

---

[1]۔ الزلزلة: 3:99

[2]۔ یس: 52:1

[3]۔ التفسير البيانى للقرآن الكريم، 86:1

[4]۔ النازعات20:79

یدِ بیضا ہے۔ جب کہ بعض مفسرین کے بقول اس سے حضرت موسیٰؑ کا عصا مبارک مراد ہے جو کہ سانپ بن جاتا تھا۔ بعض مفسرین کے بقول اس سے مراد عصا اور ہاتھ دونوں ہیں۔ ان دونوں کو ایک ہی نشانی کہا گیا کیوں کہ عصا بھی تو ہاتھ ہی میں ہوتا ہے۔ بنتِ الشاطئ ان تمام مفسرین کے اقوال کو ردّ کرتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ قرآن مجید نے اس لفظ "**الآیۃ الکبری** (بڑی نشانی)" کو ان دونوں چیزوں میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی خاص نہیں کیا۔ لہٰذا مفسرین کی یہ تاویل بے جا تاویل ہے جو کہ بنا کسی دلیل کے ہے۔[1]

۳۔ ﴿كَلَّآ إِنَّ ٱلۡإِنسَٰنَ لَيَطۡغَىٰٓ﴾[2]، "خبردار! بے شک انسان سرکش ہو جاتا ہے۔" مذکورہ آیت کی تفسیر و تشریح میں بنتِ الشاطئ لکھتی ہیں کہ بعض مفسرین نے لفظ "**لَيَطۡغَىٰٓ**" سے انسان کا مال و جاہ کی محبت میں غرق ہو کر سرکشی پر اترنا مراد لیا ہے۔ پھر وہ اس قول کا ردّ کرتے ہوئے لکھتی ہیں: یہ عبارت اس بات پر واضح دالّ ہے کہ اس لفظ سے انسان کا اپنے خالق سے مستغنی ہو کر سرکشی کرنا مراد ہے، جب انسان کی عزتِ نفس اسے گناہ تک لے جاتی ہے اور اس کا حاصل کیا ہوا علم اسے فتنہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔[3]

(5) بنت الشاطئ اور قرآن کا سائنسی اعجاز

چالیس سال تک ڈاکٹر عائشہ بنتِ الشاطئ نے جریدہ "اہرام" میں کئی مقالات لکھے، بعض مقالات ڈاکٹر مصطفی محمود کے سائنسی اعجاز کے نظریہ کی تنقید میں بھی لکھے۔ جواباً ڈاکٹر مصطفی محمود نے بھی بنتِ الشاطئ کے ردّ میں لکھا۔ بنتِ الشاطئ کے یہ علمی مقالات ایک بہترین مرجع کے طور پر ذکر ہوتے ہیں اور اعجازِ سائنسی سے دلچسپی رکھنے والوں کو لازماً ان سے مستفید ہونا چاہیے۔[4] سائنسی اعجاز کا ایک خاص نظریہ ہے جس کا بنتِ الشاطئ نے ردّ کیا اور اسے واہمہ قرار دیا۔ آپ فرماتی ہیں:

"ہمارے زمانہ کے لوگوں کی عقل اور ضمیر کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے کہ ان کے بقول جب تک

1۔ التفسیر البیانی للقرآن الکریم، 145:1

2۔ العلق6:96

3۔ التفسیر البیانی للقرآن الکریم، 2 :24

4۔ یہ مقالات بعد میں بنتِ الشاطئ کی کئی کتابوں میں شائع بھی ہوئے، جیسا کہ بنت الشاطئ کی تصنیف "القرآن وقضایا الإنسان"، میں بھی اس کا مواد موجود ہے۔

قرآن مجید سے طب، ریاضیات، فلکیات، فارمیسی، بائیالوجی، الکٹرون اور ایٹم بم سے متعلقہ سائنسی علوم ثابت نہ کر دیئے جائیں اس وقت تک اسے ہمارے زمانے کے موافق صحیح شمار نہیں کیا جا سکتا۔"[1]

بنتِ الشاطئؒ نے سائنسی تفسیر کرنے والے مفسرین کے لیے کئی مقامات پر بہت سخت الفاظ استعمال کیے ہیں جس کی نتیجے میں بنتِ الشاطئؒ کے متعلق یہ معروف ہو گیا کہ انہوں نے قرآن مجید کے سائنسی اعجاز کی مخالفت کی ہے لیکن بنتِ الشاطئؒ کی کتابوں بالخصوص ان کی کتاب "القرآن وقضایا العصر" جس میں انہوں نے مصطفی محمود کی تالیف "القرآن... محاولۃ لفهم عصري" کا علمی محاسبہ کیا ہے، [2] کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر عائشہ بنتِ الشاطئؒ نے سائنسی اعجاز کا کلّی طور پر انکار یا اس کی بالکلیہ مخالفت نہیں کی بلکہ انہوں نے سائنسی اعجاز کی مشروط طور پر تائید کی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ انہوں نے مسلمہ سائنسی اصولوں کی مخالفت نہیں کی، بلکہ آپ نے بذاتِ خود یہ بات کہی ہے کہ اگر سائنسی تفسیر اصول وضوابط اور مسلمہ علمی قیود کے ساتھ مزین ہو تو آپ اس کے مخالف نہیں۔ آپ کی کتابوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے سائنسی تفسیر کی بجائے مصطفی محمود کی کتاب میں استعمال ہونے والے لفظ "جدید تفسیر" کا محاسبہ کیا ہے۔ اگرچہ "سائنسی تفسیر" اور "جدید تفسیر" کے عنوانات کے درمیان موضوعاتی اشتراک موجود ہے تاہم اس کے باوجود اِن دونوں کا فرق معمولی نہیں۔ بنتِ الشاطئؒ نے ان کی "جدید تفسیر" کی مخالفت اس وجہ سے کی ہے کہ ان کے بقول یہ تفسیر صرف عصرِ حاضر کی اکتشافات وایجادات کے موافق کی گئی ہے لیکن زمانہ بدلنے کے ساتھ ہی اس تفسیر کی اہمیت بھی ختم ہو جائے گی۔ آپ نے سائنسی تفسیر کے جس پہلو کو قبول کیا، اس کے متعلق آپ فرماتی ہیں:

"میں اس بات کو سمجھ سکتی ہوں کہ ایک ڈاکٹر اپنی فہم وفراست کے مطابق قرآن کی کچھ آیات کو اپنی طب کے ساتھ متصل کر دے، یا ایک کسان اپنے فہم کے مطابق بعض قرآنی آیات کو نباتات، پھلوں، کھیتی باڑی وغیرہ کے ساتھ ملا دے، یا ایک کیمسٹری دان قدرتِ الٰہی کی نشانی سے اس نتیجے پر پہنچے کہ اللہ رب العزت نے ہر بندے کے پوڑوں اور جوڑوں کی بناوٹ اس طرح بنائی

1۔ القرآن وقضايا الإنسان، ص:279

2۔ ایضاً، ص:347

ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان کے پوڑوں سے نہیں ملتے، یا ایک جغرافیہ دان دو سمندروں کے ملنے
کے حوالے سے قدرت الٰہی کے اس مقام پر آ کر ٹھہر جائے کہ ایک سمندر میٹھے پانی کا ہے جبکہ
دوسرا نمکین کھارے پانی کا، اور اللہ رب العزت نے ان کے مابین ایسی حائل / رکاوٹ رکھی ہے کہ
ان دونوں میں سے ایک بھی اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرتا، یا کوئی ماہر فلکیات قدرتِ الٰہی کی اس
نشانی کو دیکھ کر ورطہء حیرت میں کھو جائے کہ اللہ رب العزت نے فلک کو بغیر ستون کے کھڑا کر دیا
ہے اور ہم سب اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی زمین و آسمان کے بنانے اور دن رات کے
اختلاف میں عقل و شعور رکھنے والوں کے لیے جو نشانی ہے وہ سب کے سامنے ہیں۔ میں یہ اور اس
طرح کی تمام چیزیں سمجھ سکتی ہوں۔ لیکن جو بات سمجھنے سے میں قاصر ہوں، اور نہ ہی میں اس کو
سمجھ سکتی ہوں، وہ یہ ہے کہ جدید مفسرین [1] ان جیسی (سائنسی) چیزوں میں غور و خوض کرتے
ہوئے یہ جسارت کر ڈالیں کہ ان میں سے کوئی ایسی قرآنی تفسیریں لے آئے جس میں وہ طب،
ڈاکٹری، فزکس، کیمسٹری، جغرافیا، انجینیرنگ، فلکیات، زراعت، حیوانات و حشرات، بائیالوجی،
جیالوجی، بشریات اور انتھراپالوجی ہی کو بھر دے۔" [2]

بنتِ الشاطیٔ کے بقول قرآن کے الفاظ و معانی سے سائنسی اعجاز کا ثابت نہ ہونا قرآن مجید کے لیے کوئی نقص نہیں بلکہ اس سے سائنسی اعجاز کو ثابت کرنا کسی بھی طرح قرآن کے مفاد میں نہیں ہے کیوں کہ سائنسی ایجادات کے بارے میں آئے دن موقف بدلتا رہتا ہے۔ بے شک موصوفہ سائنسی تفسیر کے بالکلیہ خلاف نہیں تھیں لیکن وہ اس کے اصول و ضوابط مقرر کروانا چاہتی تھیں۔ [3]

(6) قرآنی قراءات اور بنتِ الشاطیٔ

آپ فرماتی ہیں کہ تیسرے خلیفہ عثمان بن عفانؓ کے زمانے میں قرآن مجید کو ایک قراءت پر اکھٹا کیا گیا، اور اس مصحف کے مزید نسخے بنا کر مختلف اسلامی ممالک میں بھیج دیے گئے اور یہ حکم دیا گیا کہ پہلے سے موجود دیگر نسخہ

---

[1]۔ ڈاکٹر عائشہ بنتِ الشاطیٔ کا اصل اشارہ یہاں پر مصطفی محمود کی طرف ہے۔

[2]۔ القرآن وقضايا الإنسان، ص:350

[3]۔ القرآن وقضايا الإنسان، ص:350

جات کو جلا دیا جائے، یہ کام صحابہ کرامؓ کی مشاورت اور فیصلے سے ہوا۔ ایسا فیصلہ ضرورت کے پیشِ نظر کیا گیا تھا تا کہ مستقبل کے خطرات سے محفوظ رہا جا سکے۔ نبی اکرم ﷺ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں قرآن مجید کے کلمات میں حروفِ سبعہ کی یہ تلاوت کسی پریشانی یا شک و شبہ کا باعث نہ بنی کیوں کہ عرب کے مسلمان اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ قبائل کے لہجات مختلف ہونے کی بنا پر فرق صرف الفاظ میں ہے جب کہ الفاظ کے معانی تمام لہجات میں ایک ہی ہیں۔[1] لیکن جب عرب کے مسلمانوں نے شام، مصر اور عراق کے علاقہ جات فتح کیے اور غیر عرب بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تب قرآن مجید کے الفاظ کو مختلف لہجات میں پڑھنے کی وجہ سے لوگوں میں اختلافات شروع ہو گئے اور نئے مسلمانوں نے ایک دوسرے کی قراءات کو غلط کہنا شروع کر دیا تو صحابہ کرامؓ کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں لوگ قرآن مجید کے بارے میں اسی طرح شکوک و شبہات میں نہ پڑ جائیں جیسا کہ یہود و نصاریٰ اپنی اپنی الہامی کتابوں کے بارے میں اختلاف کا شکار ہو کر اصل تعلیمات سے دور نکل گئے۔[2] حضرت حذیفہؓ کے کہنے پر حضرت عثمانؓ نے دیگر صحابہؓ سے مشاورت کرنے کے بعد قرآن مجید کو ایک ہی قراءات پر لکھنے اور پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ آپؓ نے حضرت زیدؓ کی سرپرستی میں صحابہؓ کی ایک کمیٹی بنائی تا کہ وہ قرآن مجید کو قریش کی لغت پر لکھیں جس کے مطابق اللہ کے نبی ﷺ نے آخری مرتبہ میں تلاوت فرمائی تھی۔ لہٰذا ایک مصحف تیار کیا گیا جو 'مصحف امام' کے نام سے معروف ہے، اس کے چار نسخے[3] تیار کروائے گئے،

---

[1]۔ القرآن وقضايا الإنسان، ص:289

[2]۔ یہ واقعہ حدیث کی بہت سی کتب میں موجود ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاري، باب جمع القرآن، 1908:4

[3]۔ بنتِ الشاطیٔ کے بقول صرف چار نسخے ہی تیار کیے گئے تھے۔ جب کہ اس حوالے سے کئی روایات موجود ہیں؛ کسی روایت کے مطابق حضرت عثمانؓ نے چار، کسی روایت کے مطابق اس کے پانچ اور کسی روایت کے مطابق چھ نسخے تیار کروائے (مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: الرومی، فہد بن عبد الرحمٰن، جمع القران الكريم فی عهد الخلفاء الراشدين، مجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشريف، سعودی عرب، 2000ء، ص:31؛ المرزوق، محمد عبد العزيز ، المصحف الشريف دراسة تاريخية فنية، الهيئة المصرية العامة للكتاب، قاہرہ، ۱۹۷۵ء، ص:13؛ ابو داؤد کی روایت کے مطابق حضرت عثمانؓ نے سات نسخے تیار کروائے۔ ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ آپؓ نے آٹھ نسخے تیار کروائے، مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: جمع القران الکریم فی عهد الخلفاء الراشدین، ص:32۔ بہر حال قدیم مؤرخین و محدثین کا یہی موقف ہے کہ چار نسخے تیار کروائے گئے تھے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: عبد العزيز سالم، أضواء على مصحف عثمان بن عفانؓ ورحلته شرقاً وغرباً، مؤسسة شباب

ایک نسخہ مدینہ میں رکھا گیا باقی نسخہ جات کوفہ، بصرہ اور شام بھیج دیے گئے۔[1]

بنتِ الشاطیٔ کا کہنا ہے کہ ممکن ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ نے حضرت عثمان بن عفانؓ کی رائے سے اختلاف بھی کیا ہو لیکن حضرت عثمانؓ کو ان جلیل القدر صحابہ کی بھرپور حمایت حاصل تھی جن کی رائے اہمیت رکھتی تھی اور وہ مشکل کی اس گھڑی میں حضرت عثمان کی رائے سے متفق تھے۔[2]

اس بحث کا خلاصہ بنتِ الشاطیٔ یہ نکالتی ہیں کہ جن مختلف قراءات کا ثبوت تواتر کے ساتھ ثابت ہے وہ سات ہیں اور ان سات مشہور متواتر قراءات میں سے کسی بھی قراءت کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کی جا سکتی ہے، لیکن یہ جائز نہیں کہ قرآن مجید کی قراءت کوئی شخص اپنی مرضی اور اجتہاد سے کرے کیونکہ امت کا صرف ان سات قراءات پر اجماع ہے جنہیں قراءات کے ماہر حضرات نے پیش کیا ہے اور مسلمان کئی نسلوں سے ان قراءات کے مطابق قرآن کی تلاوت میں مشغول ہیں۔[3] اس اعتبار سے قرآنی قراءات کے بارے میں موصوفہ کا موقف جمہور علماء کے موقف کے مطابق ہے، البتہ موصوفہ شاذ قراءات سے تفسیری و فقہی استدلال کی قائل نہیں ہیں۔

(7) اسرائیلی روایات اور بنتِ الشاطیٔ

بنتِ الشاطیٔ کے بقول قرآن مجید کی تفسیر پر ماحول اور حالات بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں اور اسی لیے قرآن مجید کی آیات کو سمجھنے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ علاوہ ازیں سیاسی اور مذہبی عوامل بھی قرآنی آیات کی تفسیر میں اثر انداز ہو سکتے ہیں، کچھ تفاسیر خواہشات یا عصبیت کی نمائندگان بھی ہو سکتی ہیں، کچھ تفاسیر میں مفسرین منکر اور بدعتی نوعیت کے اعتقادات بھی پیش کرتے ہوں گے۔ اس سب کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات کی تفسیر کا ایک ذریعہ اسرائیلی روایات بھی رہا ہے جس کی مدد سے یہودیوں نے قرآن مجید کی غلط تشریحات کیں تا کہ وہ قرآن کو مختلف فیہ بنا سکیں۔ غیر مسلموں میں سے جو لوگ نبی مکرم ﷺ پر ایمان لائے اور آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی، وہ صحابہؓ کے نام سے معروف ہوئے اور امت نے اپنے دینی معاملات کی تفسیر و تشریح کے لیے ان کی طرف رجوع کیا، ان

الجامعة، اسکندریہ، 1991ء، ص:18

[1]۔ القرآن وقضايا الإنسان، ص:290

[2]۔ ایضاً، ص:291

[3]۔ ایضاً، ص:340

اصحابؓ نے آپؐ کے زمانہ کے بعد آنے والے لوگوں کی آسانی کے لیے قرآن کی مختلف آیات کی توضیح کی۔ یہودیوں میں سے جو لوگ مسلمان ہوئے اور انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر کے حوالے سے اپنی سابقہ کتب کے مطابق جو تاویلات و تشریحات پیش کیں، ان تاویلات و تشریحات کو عرفِ عام میں "اسرائیلیات" کہا گیا۔[1]

عبرت کی غرض سے قرآن میں کئی سابقہ امتوں کے واقعات اجمالی طور پر ذکر ہوئے ہیں۔ اسی طرح غیبی چیزوں سے متعلقہ بہت سی آیات قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ مسلمانوں کے پاس ان چیزوں کا صرف اتنا ہی علم تھا جتنا کہ قرآن مجید نے ان کو بتادیا۔ چونکہ یہودیوں کا علمی ورثہ دینی کہاوتوں سے بھرا پڑا تھا، اس لیے انہوں نے ان کہاوتوں کو ان مجمل آیات کی تفصیل و تشریح میں بیان کیا جس وجہ سے تفسیرِ قرآن میں اسرائیلی روایات آنا شروع ہو گئیں۔ بے شک ایسی اکثر روایات من گھڑت ہی تھیں کیوں کہ خود سے واقعات گھڑ لینا یہودیوں کی فطرت میں تھا اور قرآن مجید کی کئی آیات[2] بھی اس بات کی گواہی دیتی ہیں۔ آپؐ نے صحابہؓ کو اہلِ کتاب کی روایات سننے سے نہیں روکا بلکہ ان کے مطابق عمل کرنے سے منع فرمایا کیوں کہ ان کی تعلیمات میں سے صحیح تعلیمات اور صحیح اقوال کو باطل و تحریف شدہ اقوال سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ چونکہ صحابہ کرامؓ کو یہودیوں کی روایات نقل کرنے سے منع نہیں فرمایا تھا لہٰذا یہ روایات بآسانی قرآنی آیات کی تفسیر میں بھی شامل ہو گئیں اور مسلمان آج تک ان سے چھٹکارا نہ پا سکے۔[3]

بنتِ الشاطئ فرماتی ہیں کہ اسرائیلی روایات پر توقف کرنا چاہیئے۔ ہمارے کئی مفسرین قرآنی آیات کی تفسیر کے دوران اسرائیلی روایات ذکر کر کے ان کو قرآنی آیات سمجھنے میں مدد لیتے ہیں، یہ طرزِ عمل درست نہیں ہے۔[4]

(8) مباحث قسم اور بنتِ الشاطئ

لغت کے اعتبار سے قسم کو بات میں تاکید پیدا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے[5] جس سے کسی بات کے

1۔ القرآن وقضايا الإنسان، ص:290

2۔ مثلاً دیکھیے: سورة البقرة: 75:22، 78؛ سورة تلك الرسل: 78:3

3۔ القرآن وقضايا الإنسان، ص:297-299

4۔ القرآن وقضايا الإنسان، ص:290

5۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: ابن يعيش، يعيش بن على، شرح المفصل، مكتبه المثنى، قاہره، 90:9

معانی و مقاصد خوب واضح ہوتے ہیں۔[1] قسم کھانے کے لیے جو حروف مستعمل ہیں ان میں سے معروف "باء"، "تاء" اور "واو" ہیں۔[2] اہلِ عرب کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ اپنی گفتگو، اشعار، خطابات وغیرہ میں کسی بات کی تاکید یا مختلف اشیاء کی تعظیم کے لیے قسم کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔[3] چوں کہ قرآن کا نزول عربی لغت میں ہوا لہٰذا اس میں بھی کئی مقامات پر مختلف انداز میں قسم کھائی گئی ہے۔

اگرچہ بنت الشاطیؒ نے مستقل طور پر قسم کے حوالے سے کوئی کتاب یا تفصیلی بحث نہیں کی، لیکن اس ضمن میں آپ کا موقف علمی حلقوں میں بڑا معروف ہوا۔ آپ کے بقول قرآن مجید میں وارد ہونے والے قسم کے الفاظ ،مثلاً "واو" لغت میں اصلاً قسم کے معنی میں مستعمل ہے اور اسی لیے جمہور مفسرین نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ واو قسمیہ کے بعد مذکور چیز (یعنی مقسم بہ) کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ اس کی تعظیم و تاکید مطلوب ہے۔ لیکن بنت الشاطی کی رائے میں اس نقطہ نظر کی وجہ سے مفسرین کو "مقسم بہ" کی تعظیم یا تاکید کی وضاحت کے لیے ہر جگہ دور از کار تاویلات کا سہارا لینا پڑا ہے۔[4]

ان کے نزدیک ایسے مقامات پر کسی بلاغی مقصد کی وجہ سے "واو" اپنے اصل لغوی معنی (یعنی قسم) سے ہٹ کر التفات کے لیے استعمال ہوئی ہے اور یہ بیان کی ایک صورت ہے۔ مثلاً سورۃ **وَالْعَادِيَاتِ** میں گھوڑوں کے ذریعے جس جنگ و جدل کی منظر کشی کی گئی، اس سے گھوڑوں کی تعظیم قطعاً مقصود نہیں ہے بلکہ اس وحشتناک حسی صور تحال کی منظر کشی سے، بنت الشاطی کے نزدیک، قاری کی توجہ اس وحشت ناک منظر کی طرف مبذول کرانا مقصود ہے جو روز قیامت بپا ہو گا اور ابھی وہ غیر حسی ہونے کی بدولت قارئین کے دل اور دماغ سے اوجھل ہے۔ اس لیے جب واو التفات کے ذریعے ایک بلاغی مقصد حاصل کر رہی ہے تو اسے چھوڑ کر گھوڑوں کی فضیلت و عظمت پر تاویلیں باندھنا درست نہیں ہو گا۔[5] اسی طرح کی بحث موصوفہ نے سورۃ وَالنّٰزِعَاتِ میں بھی اٹھائی ہے ۔[6]

---

[1] ۔ السيوطی، عبد الرحمن بن ابو بکر، الإتقان في علوم القرآن، الهيئة المصرية العامة للكتاب، مصر ،1974ء، 4: 53

[2] ۔المبرد، محمد بن يزيد ، المقتضب، عالم الكتاب، بيروت، 1999ء، 2: 318؛ ابن سراج، الاصول فی النحو، مؤسسة الرسالة، بيروت، 1405ھ، 1: 431؛ الإيضاح العضدي، ص263

[3] ۔ دیکھیں: الزركشي، بدر الدين، البرهان فی علوم القرآن، دار المعرفة للطباعة والنشر، بيروت، 3: 41

[4] ۔التفسير البيانی للقرآن الكريم، 1: 103

[5] ۔ ایضاً، 1:104

[6] ۔ ایضاً، 1:124

خلاصہ و نتائج بحث

اپنے استاد اور شوہر امین الخولی سے متاثر ہو کر محترمہ عائشہ بنتِ الشاطیٔ نے بظاہر سابقہ مفسرین کی عمومی روش سے ہٹ کر تفسیر کا ایک نیا منہج یا کچھ نئی جہات متعارف کرائی تھیں، لیکن اس سے بنتِ الشاطیٔ کے افکار کا مطالعہ کرنے والے اصحاب کو یہ واہمہ نہ ہو کہ بنتِ الشاطیٔ اسلامی روایت کے تفسیری ادب کی کلیتاً ناقد و مخالف تھیں یا انہوں نے متقدم مفسرین اور روایتی تفسیری ادب کی کماحقہ تعظیم نہیں کی۔ حقیقت میں ایسا نہیں۔ موصوفہ نے اپنے تفسیری کاموں میں مختلف مقامات پر سابقہ تفاسیر سے استدلال کرتے ہوئے ان کے حوالے دیے ہیں، ان سے روایات اور اقوال کو نقل کیا ہے، ان سے لغوی و ادبی استفادہ بھی کیا ہے، ان کی موقع بہ موقع تحسین بھی کی ہے۔ البتہ اہم بات یہ ہے کہ موصوفہ نے تفسیری ادب پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے اپنی علمی خدمات پیش کی ہیں اور اگر کسی جگہ سابقہ مفسرین کے موقف سے بنتِ الشاطیٔ کو علمی اختلاف ہوا ہے تو اسے بھی انہوں نے بہت مناسب پیرائے میں ذکر کیا ہے جس کی بہت سی مثالوں میں سے بعض کا مضمون میں تذکرہ کیا گیا۔ قرآنی مباحث میں قسم اور کچھ نہ کچھ سبب نزول کے باب میں بھی آپ روایتی مفسرین سے ایک جداگانہ رائے رکھتی ہیں۔ احادیث و آثار تفسیر قرآن میں آپ نے بہت سی جگہوں پر استشہاد کیا ہے، لیکن ایسے مقامات بھی موجود ہیں جہاں آپ نے بعض ایسی روایات پر نقد کیا ہے جو متقدم مفسرین کے ہاں مستند قرار پائی ہیں۔ البتہ اسرائیلی روایات کے باب میں آپ خاصی محتاط واقع ہوئی ہیں اور اس ضمن میں بھی آپ کی رائے بہت سے متقدم مفسرین سے کلی مطابقت نہیں رکھتی۔ اسی طرح قرآن مجید کی مروجہ سائنسی تفسیر کے حوالے سے بھی آپ نے ایک محتاط موقف کا اظہار کیا ہے۔ آپ نے سابقہ مفسرین کے مناہج اور تفسیری ادب کو نہ تو کلی طور پر غلط اور قابل رد قرار دیا ہے اور نہ ہی اپنے منہج و اسلوب کو ہر جگہ تحکمانہ انداز میں حتمی منہجِ تفسیر قرار دینے پر اصرار کیا ہے جو کہ آپ کے عجز و انکساری کی واضح علامت ہے۔